تار کا پتہ
"انجمن" علی گڑھ

رجسٹر نمبر اے ۹۲۲
ٹیلیفون نمبر ۲۹

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کا پندرہ روزہ اخبار

قیمت فی پرچہ ۲ ر آنے | سالانہ چندہ -/۳ روپے

جلد ۱۵ | یکم جون ۱۹۵۶ء | ایڈیٹر۔ آل احمد سرور | ۲۱ شوال المکرم ۱۳۷۵ھ | نمبر ۱۱

اردو کی تحریک اور انجمن ترقی اردو

(۳)

پچھلی اشاعت میں ہم نے جو کچھ کہا تھا اس کا ماحصل یہ ہے کہ ہمیں جذباتی طور پر نہیں بلکہ ٹھنڈے دل سے اردو کے تحفظ اور بقا کی تدابیر سوچنا ہیں اور دوسروں پر سب کچھ چھوڑنے کے بجائے خود بہت کچھ کرنا ہے۔ حکومت کو اس کے فرائض کی طرف متوجہ کرنا ہمارا جمہوری حق ہے۔ مگر حکومت کے احکام، اسم اعظم نہیں ہیں کہ ان کے جاری ہوتے ہی ہماری ساری مشکلات دور ہو جائیں۔ ہمیں اس ذہنیت کو سمجھنا ہے جس کی وجہ سے اردو کے ساتھ بے انصافی ہو رہی ہے اور اسے بدلنا ہے۔

فرض کیجئے کہ آج صدر جمہوریہ نے اعلان کر دیا کہ یوپی اور دوسرے علاقوں میں جہاں ایک معتد بہ آبادی کی زبان اردو ہے، علاقائی یا سرکاری زبان اردو بھی ہوگی تو اس اعلان کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ اس اعلان کے بعد اس پر عمل کرانے کی راہیں کھل جائیں گی۔ مگر اعلان اور عمل میں بڑا فرق ہے۔ آج بھی یو۔ پی میں اس اصول کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جہاں دس طالب علم ایک درجے میں یا چالیس ایک اسکول میں مطالبہ کریں وہاں اردو کے ذریعے سے ابتدائی تعلیم دی جائے گی۔ مگر سب جانتے ہیں کہ اس پر عمل بہت کم ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ہم نے منظم ہو کر اس حکم کی پابندی نہیں کرائی، لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ سرکاری افسر دراصل اس حکم کی زیادہ پروا نہیں کرتے اور اردو کے جائز حقوق سے غفلت برتتے ہیں اور اس پران سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی۔ بلکہ شاید انہیں یہ اطمینان ہے کہ عمل نہ کرنا عمل کرنے سے بہتر ہے۔ چنانچہ یوپی کے جن اسکولوں میں ابتدائی تعلیم اردو میں دی جا رہی ہے وہ یوپی کی شاخ کی جدوجہد کی وجہ سے کھولے گئے ہیں۔ حکام نے شاید ہی کہیں اپنا فرض سمجھ کر مناسب انتظام کیا ہو۔ اس لئے حکومت کو اس کے فرض کی طرف متوجہ کرنا تو اس لئے ضروری ہے کہ یہ ہمارا جمہوری حق ہے مگر دراصل اس سے بھی زیادہ ضروری اکثریت کی ذہنیت کو بدلنا ہے تاکہ وہ اردو دشمنی کی کوشش ترک کر دے۔ اس کے لئے ہمیں اول تو اپنی قوم پرستی کا مزید ثبوت دینا ہوگا یعنی ملک کی ترقی میں اور بھی حصہ لینا ہوگا۔ دوسرے ہندی پر اعتراضات ترک کرنے ہونگے جس کے پیچھے ایک قومی جذبہ ہے، تیسرے اردو ادب کے جواہر پاروں کو ہندی رسم الخط میں بھی شائع کرنا ہوگا تاکہ اردو میں ہندوستانی تہذیب کے جو غیر فانی نقوش ہیں وہ سب پر آئینہ ہو جائیں اور اردو اکثریت کے دلوں میں گھر کر سکے۔ چوتھی اور موجودہ فضا میں نہایت اہم چیز یہ ہے کہ ہم اردو کے مسئلے کو ایک مسلم اقلیت کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ ایک لسانی اقلیت کے نقطۂ نظر سے دیکھیں اور دکھائیں۔ یہ

تعجب ہے کہ بہت سے ہندو اور سکھ اور عیسائی جو ایک زمانے میں اردو کا نام لیتے تھے اب اس سے کتراتے ہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ نئی نسل میں بہت کم ہندو اور سکھ اردو سیکھ رہے ہیں مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ ایک زمانے میں جب کانگریس میں مسلمان بہت کم رہ گئے تھے تو گاندھی جی سے کہا گیا تھا کہ اب کانگریس کے نام کے ساتھ لفظ نیشنل لگانے کی ضرورت نہیں۔ گاندھی جی نے جواب دیا تھا کہ اگر ایک بھی مسلمان نہ رہے تو بھی کانگریس ایک نیشنل یا قومی جماعت رہے گی۔ نام کے ساتھ ایک تصورِ حیات وابستہ ہوتا ہے۔ اردو کے مسئلے کو جو لوگ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں وہ اردو کے نادان دوست ہیں اگر کچھ ہندو اپنے قومی ورثے کو اپنانے سے شرماتے ہیں تو مسلمانوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ خدمت کے جوش میں اپنے ماضی اور حال سے انکار کر دیں۔ ہاں انھیں اس قومی ورثے کے امین کی حیثیت سے یہ حق پہنچتا ہے کہ ہر ایک کو اس کا فرض یاد دلائیں۔ آج نہیں تو کل اس فرض کا احساس ہو کر رہے گا۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا اردو والوں نے ملکی ترقی میں ہاتھ بٹانے کی کوئی کوشش کی ہے، یا صرف منہ پھلائے بیٹھے ہیں۔ کیا انھوں نے ہندی کو بغیر لمبی چوڑی شرطوں کے قبول کیا ہے۔ کیا انھوں نے اس کی کوشش کی ہے کہ اردو کے کچھ جواہر پارے ہندی رسم الخط میں بھی شائع ہو کر سب تک پہنچیں اور کیا انھوں نے مسلمان کی حیثیت سے نہیں اردو بولنے والے کی حیثیت سے اپنے مطالبات پیش کئے ہیں۔ سیرت کے جلسوں کے ساتھ اردو کانفرنس منعقد کرنا اور مذہبی تقریروں کے ساتھ اردو دشمنی کا ماتم کرنا دراصل مسئلے کو سلجھانے کے بجائے اور الجھا دیتا ہے۔ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں مگر دونوں مل کر اردو کے سوال کو مسلمانوں کا سوال بنا دیتی ہیں، جو ہمارے لئے آسانیاں پیدا کرنے کے بجائے مشکلات کا باعث ہوتا ہے ہم مسلمان ہونے پر فخر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلام نے جو اعلیٰ قدریں انسانیت کو دی ہیں ان سے ہمارا ملک بھی فائدہ اٹھائے ہم کو اس پر بھی فخر ہے کہ ہماری مادری زبان اردو ہے، مگر اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہ کبھی تھی نہ آج ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اس بنا پر ہندوستان صرف ہندوؤں کا تو نہیں ہے، مسلمانوں، عیسائیوں، پارسیوں اور سکھوں کا بھی ہے۔ ہندوستان کی قومی زندگی میں اگر ہندو مذہب کے اثرات نمایاں ہوں تو کوئی ہرج نہیں، مگر اس کے نقشے میں دوسرے مذاہب کے اثرات کو بھی قرار واقعی جگہ ملنی چاہئے۔ اس طرح اردو پر اگر اسلامی تہذیب تاریخ اور عرب و ایران کے اثرات ہوں تو اس میں کیا مضائقہ ہے اس کی وجہ سے اردو مسلمانوں کی جائداد اور جاگیر تو نہیں ہو جاتی۔ ہمیں اس نکتے کو بار بار ملحوظ رکھنا چاہئے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو دشمنی کی جو لہر ملک میں دوڑی اس کے خلاف ہمارا جہاد ضروری تھا۔ آج بھی اردو کو اس کا جائز منصب دلانے کے لئے جدوجہد جاری رہنی چاہئے مگر ۱۹۴۷ء میں اور ۱۹۵۷ء میں بہت فرق ہے۔ اگرچہ اردو کے ساتھ اب بھی بے انصافی ہو رہی ہے مگر اردو دشمنی پہلے سے کم ہے اب کوئی سنجیدہ آدمی اردو کو بدیسی زبان نہیں کہتا۔ اب کوئی اردو والوں کے مطالبے پر ان سے یہ کہے کہ پاکستان جاؤ تو ہم اس کے خلل دماغ کا فتویٰ دے سکتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے منفی مزاج حلقے نے رفتہ رفتہ اردو کی قومی حیثیت اور نئے ہندوستان میں اس کے منصب اور قیام کو واضح کر دیا ہے۔ اب اس کو منوانے کا سوال ہے اس کے لئے جلسوں اور کانفرنسوں سے زیادہ عملی کام کی ضرورت ہے ہم جلسوں کے خلاف نہیں۔ جلسوں کو سب کچھ سمجھنے کے خلاف ہیں۔ آج کل کئی حلقوں سے اردو کے مسئلے پر کنونشن کرنے اور الیکشن کے قرب کی وجہ سے حکومت سے اردو کا حق منوانے کا نعرہ بلند ہو رہا ہے۔ اس پر لوگ غور نہیں کرتے کہ جو قراردادیں ہم پاس کرتے ہیں ان پر عمل کیسے ہوگا دوسرے قراردادوں میں ہم سب کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ بنیادی اور جزوی باتوں میں فرق نہیں کرتے۔ تیسرے ہم یہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ عملی صلاحیت کے بغیر خالی خولی جلسے بجائے مفید ہونے کے مضر ہوتے ہیں۔ چوتھے اردو کا ہر حامی یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے الف سے ی تک صحیح ہے اور دوسرا نیک نیتی سے جو اختلاف کرتا ہے وہ الف سے ے تک غلط ہے اور اختلاف کرنے والا یا تو ابن الوقت ہے یا حکومت کا پٹھو ہے یا کسی سیاسی پارٹی کا آرگن۔ اردو والوں میں ذہنی ڈسپلن کی کمی ہے۔ لوگ بہت جلد ایک دوسرے کی نیت پر شبہ کرنے لگتے ہیں۔ پھر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ صرف مشاعرے ہوا کریں کوئی صرف جوشیلی تقریریں کر کے ہندی پر تبرا اور حکومت پر لعنت بھیجتا ہے، کوئی صرف ابتدائی مدارس کی مہم کو یاد رکھتا ہے باقی سب پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ ہندی رسم الخط مان لو سب مشکلات حل ہو جائیں گی۔ کوئی کہتا ہے اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے دو، پھر بیڑا پار ہے، کوئی کہتا ہے حکومت سے کسی طرح علاقائی زبان منوا لو، پھر خیریت ہے۔ کوئی پکارتا ہے لوگو الیکشن قریب ہے یہ نفسیاتی لمحہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ کوئی کانگریس سے مایوس ہو کر مخالف جماعتوں سے رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔ کوئی صرف اچھی اور سستی کتابوں کو شائع کرنے میں نجات سمجھتا ہے۔ غرض منفرد ہر شخص ہے متحد کوئی بھی نہیں۔

صحیح بنیادی اور فکری بات یہ ہے کہ ہم آج صرف ایک محاذ پر نہیں لڑ سکتے ہمیں کئی محاذوں کی لڑائی ہو

* ہر محاذ پر لڑی جاتی ہے ہمیں بہت سے کام ایک ساتھ کرنے ہیں، گو ان میں اہمیت کے اعتبار سے ترتیب قائم کرنی ہے اور تقسیم کار کے اصول پر چلنا ہے۔ اس وقت ملک میں اردو کے بہت سے ادارے ہیں۔ اگر یہ سب اپنے اپنے علاقے میں اردو کی خدمت کرتے رہیں لیکن ان کے کاموں کی تنظیم دار اردو کی تحریک کی قیادت انجمن ترقی اردو کرے تو اب بھی ہم اردو کی مہم میں کامیاب ہو سکتے ہیں

کل ہند اردو کانفرنس حیدرآباد

حیدرآباد میں ۱۸ سے ۲۰ مئی تک بہت بڑے پیمانے پر کل ہند اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت **پروفیسر محمد مجیب** وائس چانسلر جامعہ ملیہ نے کی۔ کانفرنس میں شرکت کی غرض سے دلی، لکھنؤ، بمبئی، علی گڑھ، ناگپور، کرنول، دھارواڑ، گنٹور، کڑپہ، بنگلور، بنڈیال، شمالی مدراس اور مالیگاؤں سے بہت بڑی تعداد میں شاعروں، دانشوروں، پروفیسروں اور تہذیبی کارکنوں پر مشتمل ڈیلیگیٹ آئے تھے جن میں حضرت جگر مرادآبادی، ڈاکٹر عبدالحق، سید سجاد ظہیر، آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم، سیف طیب جی، شہاب الدین دسنوی، سردار جعفری، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، حمیدہ سلطان بیگم، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان، غلام ربانی تاباں، مدن موہن کالیہ، فقیر زیدی، فقیر بادشاہ قادری قابلِ ذکر ہیں۔

مختلف علاقوں سے جو ڈیلی گیٹ آئے تھے ان میں آندھرا کا ڈیلیگیشن سب سے بڑا تھا۔

کانفرنس کے دوران میں اردو تھیٹر علی گڑھ نے ۱۸ اور ۱۹ مئی کی رات کو دو ڈرامے پیش کئے اور ۲۰ مئی کی رات کو حضرت جگر مرادآبادی کی صدارت میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔

کانفرنس کا آغاز ۱۸ مئی کی شام کو ۶ بجے لیڈی حیدری کلب کے وسیع میدان میں ہوا جہاں ایک خوبصورت اور وسیع کھلا تھیٹر اسی غرض سے بنایا گیا تھا۔ اخبارات کے اندازے کے بموجب افتتاحی اجلاس میں پانچ ہزار سے زائد لوگوں نے شرکت کی جن میں حیدرآباد حکومت کے وزراء، پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ارکان، مختلف سیاسی اور طبقہ واری تنظیموں کے رہنما، علاقائی زبانوں کے لیڈروں اور کارکنوں کے علاوہ عام شہریوں، نوجوانوں اور طالب علموں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

کانفرنس کی کارروائی کا آغاز اقبال کے ترانے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سے ہوا۔ جس کے بعد صدر استقبالیہ جناب **نرسنگ راؤ صاحب** ایم۔ایل۔اے، سابق ایڈیٹر "رعیت" نے اپنا خطبہ پڑھا۔

موصوف نے مہمانوں اور ڈیلیگیٹوں کا سواگت کرتے ہوئے کہا۔

"اس عظیم الشان اور تاریخی شہر حیدرآباد میں کل ہند اردو کانفرنس کا انعقاد تاریخ ہند کے ایک نازک دور میں ہو رہا ہے۔ زبان کی بنیاد پر نئے صوبے بن رہے ہیں اور پورے ملک میں لسانی اقلیتوں کے تحفظ کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔ ہمارے ممتاز قائدین نے بارہا یہ وعدہ کیا ہے کہ لسانی اقلیتوں کے مسئلہ کو بہت احتیاط اور وسعت نظر کے ساتھ حل کیا جائے گا۔ اس کانفرنس میں بھی ہندوستان میں اردو کے موقف پر غور کیا جانے والا ہے۔ مجھے امید ہے کہ کانفرنس کے فیصلے نہ صرف اردو کے لئے بلکہ دوسری لسانی اقلیتوں کے لئے بھی مفید ثابت ہوں گے۔

پچھلے چند دنوں سے اردو کے حامیوں میں اردو کے مستقبل سے مایوسی کا اظہار کیا جا رہا ہے لیکن میں ان لوگوں میں سے نہیں جو مایوس ہوتے ہیں کیونکہ مجھے سر تیج بہادر سپرو آنجہانی کے اس خیال سے پورا اتفاق ہے کہ "اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے" اور میں وزیر اعظم شری نہرو کے اس بیان کا کہ "اردو بولنے پر مجھے فخر ہے" دل سے قائل ہوں۔ اردو جب کسی ایک فرقے کی زبان ہی نہیں ہے اور اس کے بولنے والے کروڑوں کی تعداد میں ملک بھر میں موجود ہیں تو کس طرح اس زبان کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں اس کو موزوں جگہ دینے کی ضرورت ہے۔ اور یہی اس کانفرنس کا مقصد ہے۔

اس کانفرنس کے فیصلوں اور اس کو روبہ عمل لانے کی کوششوں سے اردو کا نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ مجھے تو آسمان پر اندھیرے کی بجائے روشنی نظر آ رہی ہے۔ اب اردو کی مشکلات کا عبوری دور ختم ہو رہا ہے۔ اور جنوبی ہند کی حد تک تو یہ بات واضح طور پر سامنے آ رہی ہے کہ نئے صوبہ جات آندھرا، مہاراشٹرا اور کرناٹک میں اردو ہی تلنگی، مراٹھی اور کنٹری کے بعد دوسری بڑی زبان ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ دوسری بڑی زبان کا موقف متعین ہونے کے بعد اس کے ساتھ کس طرح ناانصافی ہو سکتی ہے۔

"حیدرآباد اردو کا گہوارہ اور مرکز ہے۔ کچھ لوگوں کو یہ شبہ ہے کہ جب وشال آندھرا قائم ہو جائے تو اردو کا کیا موقف رہے گا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ دہلی تو مغل تہذیب کا مرکز تھی۔ جب انگریزوں نے

اقتدار حاصل کیا اور دہلی کو راجدھانی بنایا تو کیا اردو ختم ہو گئی اور اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے، اور میں کیا ساری دنیا یہی کہے گی کہ یقیناً نفی میں ہے تو میں آپ سے پوچھوں گا کہ حیدرآباد سے بھی جو اردو کا گہوارہ ہے کسی طرح اردو فنا نہ ہوگی! اردو حیدرآباد میں باقی رہے گی اور شان کے ساتھ باقی رہے گی۔ اس شہر کی تلگی، مرہٹی اور کنڑی بولنے والے آئندہ بھی بولتے رہیں گے۔ کیونکہ یہ سب کی مشترکہ زبان رہے گی۔

جس طرح تلگو اور فارسی کسی زمانے میں قریب اور متحد تھیں اسی طرح اب اردو اور تلگو کے اتحاد کا دور آرہا ہے اسی لئے حیدرآباد کی حد تک اردو کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مجھے توقع ہے کہ کانفرنس کے علمی مباحث اور تاریخی فیصلے ہندوستان کی نئی لسانی تاریخ کا ایک اہم باب ثابت ہوں گے۔

کانفرنس کا افتتاح ڈاکٹر بی۔ رام کرشنا راؤ

چیف منسٹر حکومت حیدرآباد نے کیا۔ موصوف نے اپنی تقریر میں اس یقین کا اظہار کیا کہ نئے لسانی نقشے میں اردو زبان کو اس کا جائز مقام ملے گا۔ اس زبان کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اس لئے کہ وہ ہماری مشترکہ میراث ہے اور اس کو ہندوستان کی قومی زندگی میں دوسری زبانوں کے ساتھ اپنا تاریخی فریضہ انجام دینا ہے جس زبان کا ادب ذیشان اور عظیم ہو اور جس کی روایات شاندار ہوں اس کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ اردو زبان کسی مذہب اور فرقہ کی میراث نہیں بلکہ اس پر ہر ایک کا حق ہے۔ زبانوں کی تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ زبان کو عوام سے الگ رکھ کر زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ ہندوستان کے کروڑوں لوگ اردو بولتے ہیں۔ اس نے صدیوں ملک کی خدمت کی ہے۔ اس میں قوت اور وسعت ہے۔ اس کی تاریخ نہایت درخشاں ہے اور اس کا ادب گراں قدر اور عظیم ہے اس لئے اس زبان اور ادب کی بقا اور ترقی کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں نے زبان سے تعصب برتا ہے وہ تاریخ میں باقی نہیں رہے۔

چیف منسٹر نے حیدرآباد کا ذکر کرتے ہوئے کہا:-

حیدرآباد اردو کا گہوارہ رہا ہے جبکہ میں یہ کہوں گا تو بے جا نہ ہوگا کہ گذشتہ تیس چالیس سال کے عرصہ میں اردو کا مرکز دہلی اور لکھنؤ سے حیدرآباد منتقل ہو گیا جہاں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ ایک ایسی یونیورسٹی جس میں ایک ملکی زبان کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کا عظیم تجربہ کیا گیا۔ یہ کوشش ہندوستان میں پہلی بار کی گئی تھی۔

اردو دکن میں پروان چڑھی، پھلی پھولی اور اس قابل ہوئی کہ اس میں بڑا ادب تخلیق ہو اور ہندوستان کے مختلف علاقوں کے رہنے والوں کے درمیان اظہار خیال کا ذریعہ بنے۔ یہاں اس زبان کے ایسے بڑے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں جنھیں تاریخ ادب میں بھلایا نہیں جا سکتا۔ فارسی کے بعد یہاں اردو ہی سرکاری زبان رہی جس کی وجہ سے اس کے سرمایہ میں برابر اضافہ ہوتا گیا اس لئے مجھے یقین ہے کہ آج جبکہ ہندوستان کی زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں، سیاسی نظریے بدل رہے ہیں اور ہندوستان کا لسانی نقشہ از سر نو ترتیب دیا جا رہا ہے۔ اردو کا نہ صرف مستقبل محفوظ ہے بلکہ اس نے ہندوستان کی ثقافتی زندگی میں بڑے بڑے کارنامے انجام دئے ہیں۔

حیدرآباد میں تمام زبانوں کے درمیان دوستی اور محبت ہے۔ یہ اصل میں پانچ زبانوں کا سنگم ہے جہاں ہر زبان کی ترقی کے لئے مشترکہ کوششیں ہو رہی ہیں۔

لسانی تنگ نظری کی مذمت کرتے ہوئے چیف منسٹر نے کہا کہ دیرپا نہیں ہو سکتی۔ زبان دیوار چین کی طرح انسانوں کے درمیان کیسے کھڑی رہ سکتی ہے جبکہ وہ آپسی میل ملاپ اور انسانی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ انھوں نے ہندی والوں کو خبردار کیا کہ وہ ہندی کو سلیس زبان کی بجائے ادق بنانے کی کوشش کریں گے تو کم از کم جنوبی ہندوستان میں ہندی کے خلاف ایک ایسا جذبہ پیدا ہوگا جس سے قومی اتحاد کو خطرہ لاحق ہے۔"

اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر بی۔ رام کرشنا راؤ نے اردو کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے اپیل کی کہ وہ قومی اتحاد کو پیش نظر رکھیں اور ہندوستانی تہذیب کی مشترکہ قدروں پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دیں۔

پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر جامعہ ملیہ نے اپنے بصیرت افروز خطبے میں اردو زبان کے ہمہ جہتی مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "ایسی کوئی زبان دبائی نہیں جا سکتی جس کے ذریعہ ماں اپنے بچوں کو تعلیم دینا چاہتی ہے۔ آسٹریا کی حکومت نے سو سال سے زیادہ مدت تک بوہیمیا میں چیک زبان کو دبانے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہی۔ روس اور جرمنی دونوں مل کر بھی پولش زبان کو ختم نہ کر سکے۔

پروفیسر مجیب نے اپنا خطبہ جاری رکھتے ہوئے کہا "ہمارے ہاں فارسی صدیوں تک عدالت اور ادبی حلقوں کی زبان ہونے کے باوجود ایک عام زبان نہ بن سکی۔ علاقائی زبانیں ترقی کرتی گئیں اور اس وقت بھی ترقی کرتی رہیں جبکہ انگریزی سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم بن گئی۔ اردو نے اس وقت ترقی کی ہے جبکہ اس کو سیاسی اقتدار سے مدد نہیں ملی اور یہ ثابت ہے کہ آئندہ بھی اردو کو اپنی مدد کے لئے سیاسی اقتدار یا سیاسی اقدام کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ امر انتہائی بدبختانہ ہے کہ حالیہ برسوں میں اردو سیاست کا کھلونا بن گئی ہے۔ اب ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی

چاہیئے کہ اپنے مقاصد کو سیاسی رنگ دینے یا تمدنی مقاصد کی تکمیل کے لئے سیاسی اقدام کرنے سے احتراز کریں۔

ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اردو کی طاقت اسی میں ہے کہ وہ ایک بولی جانے والی زبان بن جائے۔ وہ اپنے اندر خاص تمدنی اور انسانی اصول اور رواداری کا جذبہ رکھتی ہے۔ یہ اوصاف برقرار رکھے جا سکتے ہیں اور اردو کا مستقبل مسلمہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم ان تمدنی اصولوں پر قائم رہیں جن کی اردو نمائندگی کرتی ہے۔

ہمیں دوسری زبانوں کی ترقی سے بھی دلچسپی لینی چاہیئے۔ اس سے ایک کل ہند زبان کی حیثیت سے اردو کا موقف مستحکم ہو جائے گا۔ اور ہمارے ملک میں لسانی ریاستوں سے پیدا شدہ تقسیم میں اتحاد پیدا کرنے والی عنصر بن جائے گی۔

اپنی تقریر کے دوران میں پروفیسر مجیب نے کہا:۔ تحتانی سے زیادہ ثانوی تعلیم پر زور دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اردو بولنے والے ماں باپ کے ہر بچے کو اردو کی ابتدائی تعلیم تو مل ہی جاتی ہے لیکن ثانوی تعلیم نہ ملے تو طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہوں گی۔

کانفرنس نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ اردو ہی ہندی کی وہ عام زبان ہے جو مشترکہ اور کل ہند تہذیب اور اس کی بنیادی قدروں سے وابستہ ہے اور جہاں آج جمالیاتی ذوق کی تکمیل کر سکتی ہے۔ جہاں انسان کو دال روٹی سے نہیں لگا سکتی اس لئے ہر اردو داں کے لئے دوسری زبان کا سیکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ لیکن جب وہ روٹی کے لئے دوسری زبان سیکھتا ہے تو اس سے جمالیاتی ذوق کی تکمیل نہیں ہوتی۔ موجودہ دور میں یہ تضاد ابھر کر ہمارے سامنے آ رہا ہے اور اس تضاد کو دور کرنے ہی سے ہمیں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے اور تب ہی حصول روزگار کے ساتھ ساتھ تعلیم کو اخلاق کے اصولوں کا پابند کیا جا سکتا ہے۔ لہذا اردو والوں کو چاہیئے کہ وہ وسعت نظر سے کام لیں بلکہ تمام علاقائی زبانوں کو ان کا حق دلوانے میں مدد دیں تب ہی وہ ہندوستان کو متحد رکھنے کی سیاسی خدمت بھی انجام دے سکتے ہیں۔"

خطبۂ صدارت کے بعد حیدرآباد کی دوسری زبانوں کی انجمنوں کی جانب سے کانفرنس کا خیر مقدم کرتے ہوئے خیر سگالی کے پیامات دیئے گئے آندھرا ساہتیہ پریشد کی طرف سے نائب صدر رامانج راؤ نے کانفرنس کا خیر مقدم کرتے ہوئے اردو کی ترقی کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

شری سری رام شرما جنرل سکریٹری حیدرآباد راجیہ ہندی پرچار سبھا نے کہا:۔ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اردو اور ہندی ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہیں اور ایک دوسرے کے سہارے آگے بڑھتی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں ہندوستان کی تہذیبی زندگی کو مکمل کرتی ہیں اس لئے اگر ہم ان کو علیحدہ علیحدہ دیکھنے کی کوشش کریں تو ہندوستان کی تہذیبی زندگی ادھوری رہ جائے گی۔

گذشتہ تین سو سال میں اردو نے نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے ایشیا کے تہذیبی تعلقات کو مستحکم کرنے میں بڑی مدد دی ہے اور موجودہ رسم خط کے ذریعے وہ ایشیائی اتحاد کے اہم اور تاریخی فریضے کو پورا کرتی رہی ہے۔ رسم خط کے اختلافات کے باوجود ہندی اور اردو ایک دوسرے سے آئندہ قریبی رشتہ جوڑیں گی۔"

شری بی۔ ایس۔ کھاڑے کر صدر مرہٹواڑہ ساہتیہ پریشد نے کہا:۔ اردو زبان اور ادب کسی خاص قوم اور ملت کی میراث نہیں بلکہ وہ ہندوستان کے کروڑوں عوام کی زبان ہے۔ اردو کا مستقبل شاندار رہا ہے اور امید ہے کہ اس کا مستقبل بھی اس کے ماضی کی طرح شاندار رہے گا۔

عوام زبان کی زندگی کے ضامن ہوتے ہیں اس لئے زبان کی بنیاد پر کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیئے۔

افتتاحی اجلاس ختم ہونے سے پہلے حبیب الرحمن صاحب جنرل سکریٹری کل ہند کانفرنس نے وزیر اعظم پنڈت نہرو، شری بی۔ جی کھیر صدر نشین آفیشل لینگویج کمیشن، ڈاکٹر سید محمود، پنڈت سندر لال، عبدالماجد دریابادی، مولانا حفظ الرحمن، مالک رام، پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ (پنجابی)، شری راجن راجیہ جسٹس مدراس (تلگو)، شری آر۔ ایس پنچ لکھی چیف ڈائرکٹر نیک ہسٹاریکل ریسرچ مدیولو (کنڑ) پروفیسر پوتا دار (مرہٹی) کے پیامات پڑھ کر سنائے۔

کانفرنس کا دوسرا اجلاس ۱۹ اپریل کو ۱۰ بجے صبح اردو ہال میں منعقد ہوا جس میں اردو زبان کے موقف تعلیم اور تحفظ کی عملی تجویزوں پر مختلف لوگوں نے بحث کی۔ سجاد مرزا صاحب۔ حبیب الرحمن صاحب شہاب الدین صاحب دسنوی۔ مخدوم محی الدین صاحب۔ علی اکبر صاحب۔ منوہر راج صاحب سکسینہ۔ فقیر بادشاہ صاحب قادری۔ مدن موہن صاحب گالیہ اور ڈاکٹر علیم نے خاص طور سے بحث میں حصہ لیا۔ آخر میں پروفیسر مجیب نے اعلان کیا کہ انھیں مباحث کی روشنی میں قرار دادیں مرتب کر کے اختتامی اجلاس میں پیش کی جائیں گی۔

سجاد مرزا صاحب نے آج کے مباحثہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی ہندوستان گیر اہمیت کے پیش نظر ہر لسانی ریاست میں اس کے تحفظ کا معقول انتظام ضروری ہے۔ دستور ہند کے بموجب ۱۴ برس کی عمر تک مادری زبان میں مفت اور جبری تعلیم کے انتظام کا یقین دلایا گیا ہے لیکن مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا اختیار بھی ملنا چاہیئے۔

لسانی تنظیم جدید کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ حیدرآباد اور سکندرآباد میں آبادی کا بڑا حصہ اردو والوں پر مشتمل ہے اس لئے اردو زبان، کلچر اور اس کی روایات کی حفاظت کے ساتھ نظام تعلیم اور نظم و نسق کے سلسلہ میں ایسی موثر تدابیر اختیار کرنی چاہئیں کہ اردو داں ملازمتوں سے محروم نہ ہونے پائیں۔ مقابلے کے امتحانات میں امیدواروں کو اپنی مادری زبان میں جواب دینے کا اختیار ملنا ضروری ہے۔ نئی ریاست کی سرکاری زبان سیکھنے اور اس میں مہارت پیدا کرنے تک اردو داں ملازمین کو پانچ سال کی مدت اور مناسب سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ نئے بھرتی ہونے والوں کے لئے یہ مدت دو یا تین سال کی کی جاسکتی ہے۔

موصوف نے سرکاری مطبوعات اور اعلانات کے لئے علاقائی زبان کے علاوہ اردو میں بھی شائع کرنے کا مطالبہ کیا اور آل انڈیا ریڈیو کی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو کو بھی مناسب مقام دیا جائے۔

مسٹر شہاب الدین دسنوی نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ تعلیمی ادارے کے مطابق تحتانی درجہ میں مادری زبان اور فوقانی درجے میں علاقائی زبان ذریعۂ تعلیم ہونی چاہئے۔ اگر تعلیم اردو میں دی گئی تو ۱۲ سال کے عمر کے بچوں کو اس زبان میں بنیادی تعلیم دی جائیگی۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ ان میں سے (۶۰) فی صدی نے آٹھویں جماعت کے بعد تعلیم جاری رکھی تو (۴۰) فی صد کے لئے مسئلہ بن جاتا ہے جو اگلی جماعتوں میں تعلیم حاصل کریں گے۔ انھوں نے انگریزی دور میں اینگلو مرہٹی اور اینگلو گجراتی مدارس کی مثال دی اور کہا کہ ساتویں جماعت تک اردو اور اس سے آگے قومی زبان ذریعۂ تعلیم ہونی چاہئے۔ انھوں نے ایک اردو یونیورسٹی کا مطالبہ کیا جیسا کہ ... ... بمبئی میں گجراتی یونیورسٹی اور پونہ میں مرہٹی یونیورسٹی ہے۔ لیکن اس کے لئے ہر جگہ اردو ہائی اسکول ہونا چاہئے۔ تاکہ جہاں اردو کے ذریعہ تعلیم کی سہولت نہیں ہے کم از کم زبانِ دوم کی حیثیت سے اردو پڑھائی جائے۔

حبیب الرحمٰن صاحب جنرل سکریٹری کل ہند اردو کانفرنس نے اردو کے تحفظ کی عملی تدابیر سے متعلق اپنی تقریر میں کہا کہ الیس۔ آر۔ سی۔ بل میں لسانی اقلیتوں کو جو تحفظات دئے ہیں ان پر عمل کا اختیار محض ریاستی گورنروں کو دینا کافی نہیں ہے بلکہ انھیں پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانون کا جزو بنانا چاہئے۔

انھوں نے بتایا کہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی جانب سے ریاستی تنظیم جدید سے متعلق سب کمیٹی کے پاس یادداشت پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا گیا ہے کہ سرکاری اور میونسپل اسکولوں میں جہاں ثانوی کی دس فی صدی یا کسی جماعت کے چالیس طلبا مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو انھیں یہ حق ملنا چاہئے کہ شہر حیدرآباد میں اردو والوں کی اکثریت کے پیش نظر شہر میں اردو کالج قائم کرنا اور جہاں بھی اردو بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہو وہاں مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا بھی انتظام ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ اردو کے ثقافتی، تعلیمی اور دوسرے اداروں کو حکومت کی طرف سے مناسب امداد ملنا چاہئے۔ سرکاری اغراض میں ریاستی زبان کے ساتھ ساتھ اردو کو استعمال کرنا اور اردو میں خط و کتابت قبول کرنا۔ سرکاری اعلانات اردو میں شائع کرنا اور دفاتر پر اردو سائن بورڈ لگانا چاہئے۔

مخدوم محی الدین صاحب نے اپنی تقریر میں اس بات پر نکتہ چینی کی کہ ریاستی تنظیم جدید کمیشن نے جن تحفظات کی سفارش کی تھی ان کو مسودہ قانون میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تنظیم جدید کے بعد سرکاری کاروبار، کارپوریشن اور حکومت مقامی کے نظم و نسق دو زبانوں میں۔ ایک تو ریاستی زبان اور دوسرے اس ریاست کی قابل لحاظ اقلیت کی زبان۔ انجام پانا چاہئے اور حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلے میں عملی اقدام کرے۔

تقریر کے سلسلہ میں شہاب الدین دسنوی صاحب کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے مخدوم صاحب نے کہا کہ لسانی ریاستوں میں جہاں بھی لوگ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں انھیں اعلیٰ تعلیم تک سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں ایسے عملی اقدام کرنے چاہئیں کہ تحفظات قانونی ضمانت حاصل کرسکیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے تجویز رکھی کہ ایک طرف تو رائے عامہ کو منظم اور ہموار کیا جائے اور دوسری طرف ایک وفد بھی روانہ کیا جائے جو اربابِ مقتدر کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کرکے انھیں اپنا ہمنوا بنائے۔

ڈاکٹر علیم نے اردو کی ہمہ گیری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ تمام علاقہ اردو کا ہے جو ہندی کا ہے۔ جنوبی ہند میں بھی اردو والوں کی بہت بڑی تعداد ہے جو مختلف لسانی علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں یا تو ہندی ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو بہت کم تعداد میں اس کے بولنے والے ملیں گے۔ شمالی ہند میں ہندی والوں کی اکثریت ضرور ہے لیکن کوئی قصبہ بھی ایسا نہیں ملے گا جہاں ہندی کے ساتھ اردو نہیں ملتی۔ اس حقیقت کے باوجود اردو کو مسلسل نظر انداز کیا جارہا ہے۔ اس لئے ضرورت

اس بات کی ہے کہ اردو زبان اور رسم خط کے تحفظ کے لئے وسیع پیمانے پر جدوجہد شروع کی جائے اور اردو والے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو جائیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اردو کی ایک وسیع تحریک چلائی جائے اور اردو والے اپنے حقوق منوانے کے لئے عوامی سطح پر جدوجہد شروع کر دیں جہاں تک روحانی اور ادبی قدریں اپنی جگہ مسلّم لیکن آج جبکہ اردو کی زندگی اور تحفظ کا سوال ہے تو ہمیں اس بھول بھلیاں سے نکلنا ہوگا۔ دمشق میں قحط پڑا تھا تو محبت بھاگ کھڑی ہوئی تھی اور جب عشق کا کال پڑ رہا ہے تو محض حسن و عشق سے کام نہیں چلے گا۔

ڈاکٹر علیم نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ پچھلے چند دنوں سے وہی لوگ جو کل تک اردو کے نام پر جھلّا اٹھتے تھے اردو کی ہمدردی کا دم بھرنے لگے ہیں۔ انتخابات کی قربت نے انھیں اردو دوست بنا دیا ہے لیکن ہمیں ان کے جھوٹے وعدوں پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے بلکہ اپنی زبان اور اپنے کلچر کے تحفظ کے لئے قانونی تحفظات کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ وعدے بھلائے جا سکتے ہیں اور ہمیں اس کا تجربہ ہے لیکن جب ہمیں قانونی تحفظ حاصل ہو جائے گا تو کسی کی ہمت نہیں ہو سکتی کہ ہمیں ہمارے قانونی حق سے محروم کر دے۔

دوسرے مقررین نے بھی انھیں باتوں پر زور دیا کہ لسانی اقلیتوں کے لئے تنظیم جدید بل میں قانونی تحفظات مہیا کئے جائیں تاکہ ان کی زبان کلچر تعلیم اور روزگار کے مسائل سلجھ سکیں اور انھیں ان کے جمہوری حقوق کے حصول کی طمانیت حاصل ہو سکے۔

کانفرنس کا دوسرا کاروباری اجلاس اسی دن (۱۹ مئی) چار بجے اردو ہال میں منعقد ہوا جس میں مقررین نے "قومی آزادی کی جدوجہد میں اردو کا حصہ" کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ زینت ساجدہ صاحبہ سکریٹری کل ہند اردو کانفرنس نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح ابھی تک تحریک آزادی کی کوئی جامع تاریخ نہیں ملتی اسی طرح اردو ادب کے ان کارناموں کی بھی کوئی مربوط تاریخ نہیں جو جنگ آزادی کے دوران میں تخلیق کئے گئے ہیں۔ حالانکہ قومی جدوجہد کے ہر موڑ پر اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنا تاریخی فریضہ ادا کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے آج تک کے ادب کا جائزہ لیا جائے اور مختلف اصناف کا ایسا انتخاب شائع کیا جائے جس سے بیک نظر اس دور کے ادبی کارناموں کا اندازہ ہو سکے۔ اور ایک ایسی تاریخ مرتب کی جائے جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ اردو کے فنکار قومی آزادی کے تمام نشیب و فراز سے گزر رہے ہیں اور اپنے فن کے ذریعہ عوام کو بیدار کرنے اور ان کے شعور کو جلا دینے کی اہم ذمہ داری کو پورا کیا ہے۔

علی سردار صاحب جعفری نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس نقطۂ نظر سے ہم جب اپنے ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو چار باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس جذبے کو جس حسن و خوبی کے ساتھ اردو نے پیش کیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی اقتدار کے خلاف اولین احتجاج اردو ہی کے ادیبوں نے کیا ہے۔ تیسرے حالی سے لے کر آج تک کبھی بھی اردو ادب نے آزادی کی تحریک کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اور چوتھے یہ کہ اردو ادیبوں نے تحریک آزادی کو محدود کر کے صرف ہندوستان کی قومی جدوجہد تک نہیں رکھا بلکہ اس کو ہمیشہ بین قومی پس منظر میں دیکھا۔

سردار جعفری صاحب نے بتایا کہ یہ بتانا مشکل ہے کہ اردو ادب میں آزادی کی تحریک کا آغاز کب سے ہوا اس لئے کہ انسانیت کو سماجی، معاشی، ذہنی اور دوسرے بندھنوں سے آزاد کرانے کا جذبہ اردو شاعری میں ابتدا ہی سے ملتا ہے۔ دوسرے شعرا سے قطع نظر میر کو لیجئے جو قنوطیت کے لئے بدنام ہیں ان کے ہاں بھی ایسے سیکڑوں شعر ملتے ہیں جن سے ان کے مثالی انسان کا تصور واضح ہو جاتا ہے۔ اور اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

بیرونی اقتدار ابھی مکمل نہیں ہوا تھا لیکن کمپنی کا راج قائم ہو چکا تھا جس نے پہلی بار ایسا سکہ رائج کیا کہ جس پر انسانی سر کندہ تھا۔ کسی دل جلے شاعر نے اس پر کہا تھا ؎

لعنت ہے ایسے سکے پر اور زر چلانے میں
سر کمپنی کا کٹ کے بکا سولہ آنے میں

جعفری نے ۱۸۵۷ء کے سیاسی حالات اور سرسید کی اصلاحی تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ اس تحریک کے بانیوں نے سیاست سے دامن بچایا لیکن حیرت ہوتی ہے جب لوگ موجودہ ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اعتراض کرتے ہیں کہ ادب کو سیاست سے الگ رہنا چاہئے۔ انھوں نے کہا اگر سیاست نام ہے سماج اور فطرت کے قوانین کو سمجھنے اور زندگی کو ان سے ہم آہنگ کرنے کا تو یقیناً سیاست ادب کا ایک حصہ ہے۔

سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے انھوں نے حالی، شبلی، نذیر احمد، اقبال، جوش، پریم چند اور دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی مثالیں دیتے ہوئے اردو ادب کے ان کارناموں کو واضح کیا جو اس نے آزادی کی جدوجہد کے دوران میں انجام دئے اور جن سے قومی اور بین قومی

واقعات کے ذخائر سے ملتے ہیں اور یہ ثابت کیا کہ قومی اور بین قومی واقعات کا ہر موڑ ہمارے ادب کے آئینہ خانہ میں محفوظ ہے۔ یہی نہیں کہ اردو ادب قومی آزادی کی جدوجہد کے ہر موڑ پر اس کے ساتھ رہے گا بلکہ اس نے ایسے نازک لمحوں میں بھی ہمارے عوام کی رہنمائی کی اور ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کی ترجمانی کی اور انھیں جھنجھوڑا دیا جب کہ سیاسی طاقتیں اور جماعتیں بحران یا موقع پرستی کا شکار ہوئیں۔

اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے جعفری صاحب نے اس تجویز کی تائید کی کہ آزادی کی جدوجہد کے صد سالہ جشن کے موقع پر اردو ادب کا ایک ایسا انتخاب شائع کیا جائے جس کے مطالعہ سے ایک طرف آزادی کی لڑائی کی صدی تاریخ ہمارے سامنے آجائے تو دوسری طرف اس کا پورا پورا اندازہ ہوسکے کہ اردو ادب نے اس جدوجہد کی ترجمانی اور رہنمائی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔ بلکہ وہ اس امتحان سے کامیاب اور کامران گزرا ہے۔

اس موقعہ پر **سیٹھ طیب جی صاحب** صدر انجمن اسلام بمبئی نے اعلان کیا کہ انجمن ترقی اردو ہند اگر اس کتاب کے مرتب کرنے کی ذمہ داری لیتی ہے تو انجمن اسلام اس کے شائع کرنے کے لئے تیار ہے۔ توقع ہے کہ بہت جلد اس سلسلہ میں ایک کمیٹی تشکیل کی جائے گی اور کتاب کی تدوین کا کام شروع ہو جائے گا۔

انصاری صاحب مالک ریڈا ئیس الڈو مو بائلس نے ایک سال تک ہر مہینے سو روپیہ اس کتاب کی تیاری کے لئے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس اجلاس میں انیشور ناتھ صاحب ماتھر، پروفیسر ہارون خاں شروانی اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے بھی تقریریں کیں۔

کانفرنس کا تیسرا اجلاس ۱۰ مئی کو صبح ۹ بجے اردو ہال میں منعقد ہوا جس میں اردو ادب کے موجودہ مسائل پر تقریریں ہوئیں۔

سید سجاد ظہیر نے اجلاس کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ قومی اتحاد، آزادی کی حفاظت، ملک کی تعمیر، ایشیائی اتحاد اور امن و آشتی کے مسائل کو ترجیح دیں۔ ہندوستان کو ہر قسم کے فوجی معاہدوں، سامراجی اثرات اور دباؤ اور انتشار سے آزاد رہنا ہے اور تہذیبی گوناگونی کے باوجود لسانیاتی اور تہذیبی وحدت کو مستحکم ہونا ہے۔ اس کے لئے دوسری چیزوں کے علاوہ مختلف لسانی گروہوں اور قومیتوں کے درمیان اتحاد اور مختلف تہذیبوں کا باہمی تعاون اور اشتراک ناگزیر ہے۔

مستقبل کے سوشلسٹ ہندوستان میں اردو اور ہندی کا قریبی اتحاد ضروری ہے۔ اس کے لئے اردو کو ایسی راہ اختیار کرنی ہوگی کہ وہ قومی اور تہذیبی اتحاد کا ذریعہ بن سکے۔ آج سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو اور ہندی والوں کے "جذباتی عناد" کو ختم کیا جائے۔ اور ان زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لایا جائے۔ اردو والوں کو ہندی سیکھنی چاہئیے اور ہندی والوں کو چاہئیے کہ اپنے دل سے یہ خیال نکال دیں کہ اردو ہندوستانی زبان نہیں اسکی وجہ سے حب الوطنی میں کمی ہوگی اور اتحاد کو دھکا پہنچے گا۔ ہندی اور اردو کھڑی بولی کی دو شاخیں ہیں۔ البتہ اردو پر فارسی اور عربی زبانوں اور ان کے ادب کا گہرا اثر ہے۔ جس کو کم کر دینے کی خواہ مخواہ ضرورت بھی نہیں۔ بیرونی اثرات فی نفسہ برے نہیں ہوتے البتہ انھیں قومی ضروریات اور تہذیبی تقاضوں کے پیش نظر خود اعتمادی کے ساتھ اور آزادانہ طور پر اپنی ادبی اور تہذیبی ضروریات کے مطابق قبول کرنا چاہیئے۔ انگریزی کے ادیبوں نے اپنی زبان اور ادب سے یونانی اور لاطینی اثرات کو ختم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ اس کی ضرورت رہی۔

ہمارے ادب ہی میں نہیں فن تعمیر، موسیقی، طرز معاشرت غرض زندگی کے مختلف شعبوں میں ایسے ان گنت مظاہر ملیں گے جو بیرونی ہیں اور اگر ہم محض اس عصبیت کی بنیاد پر کہ تمام بیرونی اثرات کو ختم کرنا ضروری ہے ان سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کریں گے تو ہمارے اس عمل کو کوئی سمجھدار اور مہذب انسان عقل مندی سے تعبیر نہیں کریگا۔ کیا ہم تاج محل اور لال قلعہ کو محض اس لئے منہدم کر دیں گے کہ ان پر ایرانی اثر غالب ہے؟

سجاد ظہیر نے اردو ادیبوں سے اپیل کی کہ وہ ہندوستانی بولیوں کا گہری نظر سے مطالعہ کریں جو ادبی خزانوں سے مالا مال ہیں۔ ایسا ادب جو ہندوستان کے عام آدمی کی روح میں رچا بسا ہے اور جس سے کٹ کر ہم ایسا ادب تخلیق نہیں کر سکیں گے جو عام آدمی کے ذہن تک راست پہنچ سکے اور اس کی مادی اور روحانی ضرورتوں کی تکمیل کر سکے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے ادب کے موجودہ مسائل پر اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اچھے ادب میں وہ تمام عناصر شامل ہوتے ہیں جو تاریخی، اقتصادی اور سائنسی علوم کے ذریعہ آتے ہیں اس لئے کوئی اچھا ادیب انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اردو ادب میں ایشیائی تہذیب کی بہترین روایات موجود ہیں جو تین تہذیبی اداروں (۱) خانقاہ (۲) بازار (۳) اور دربار کے ذریعہ پہنچی ہیں۔ اس ورثہ کو اپنے ادب میں سمونا چاہیئے لیکن ساتھ ہی قومی مزاج اور ہندوستانیت کے جذبہ کی ترجمانی بھی ناگزیر ہے۔ اچھا ادب وہی ہے جو قومی خصوصیات کا حامل ہوتے ہوئے بھی بین قومی

اثرات سے گریز نہ کرے اور ان دونوں میں کامل ہم آہنگی اور توازن پیدا کرے۔

سرور صاحب نے اردو والوں سے اپیل کی کہ وہ احساسِ شکست کے خلاف آواز بلند کریں اور کھلے دل کے ساتھ ہر اس اچھی چیز کو اپنائیں جو ہمارے قومی مزاج سے میل کھاتی اور ہماری مادی اور روحانی ضروریات کی تکمیل کرتی ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب ہم وسعتِ نظر پیدا کریں اور اپنے انتخابی شعور کو نکھاریں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اردو کے مستقبل پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی حالات اگرچہ ہمت شکن ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اردو اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور بہترین روایات کی وجہ سے زندہ رہے گی۔

ڈاکٹر علیم نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ یہ دور اردو والوں کے لئے مایوسی کا دور ضرور ہے لیکن جب ہم اردو بولنے والوں کی طرف دیکھتے ہیں اور اردو ادب کی جمہوری اور عوامی روایات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہماری امید بندھنے لگتی ہے اس لئے اردو زبان اور اس کے ادب کے مستقبل پر تشویش کرنے کی ضرورت نہیں۔ بدلے ہوئے حالات میں اردو ادیبوں اور شاعروں پر بڑی بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اس لئے آج ان پر نہ صرف ایسے ادب کی تخلیق کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو عوام کی آرزوؤں اور خواہشوں کی ترجمان ہو اور قومی آزادی کے دفاع اور تعمیر جدید کی منزل پر ان کی رہنمائی کرے بلکہ ان پر اردو زبان کی بقا اور حفاظت کا فرض بھی عائد ہوتا ہے۔ وہ اس دوہرے فرض سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ عوام ان کی زندگی، ان کی بولی اور ان کے مستقبل کے خوابوں سے اپنے ادب اور فن کا رشتہ جوڑیں جس زبان اور ادب کے سوتے عوام اور ان کی زندگیوں میں ہوتے ہیں وہ کبھی شکست سے آشنا نہیں ہوتا۔ ہمارے ادیبوں کو چاہئے کہ وہ ہندوستانیت کے جذبے کو اپنے ادب میں سموئیں اور قدیم ورثے سے جس میں عوامی بولیوں کا ادب بھی شامل ہو اپنے ادب اور فن میں وسعت، تازگی، ہمہ گیری اور بے کرانی پیدا کریں۔

سردار جعفری صاحب نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ ادب کا مسئلہ صرف ادیب یا شاعر کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس میں وہ لوگ بھی شریک ہوتے ہیں جو شعر سنتے اور کتابیں پڑھتے ہیں اس لئے ہم ادیب یا شاعر سے جن باتوں کا تقاضہ کرتے ہیں ان کا شعور پڑھنے والوں میں بھی ہونا چاہئے۔ یہی نہیں بلکہ اس شعور کی تربیت کی بھی ضرورت ہے۔

انھوں نے کہا کہ اردو ادب میں تین بڑے رجحان ہیں۔

(۱) شہر اور دیہات کی زبان کی عدم یکسانیت (۲) بول چال کی زبان اور شعر و ادب کی زبان کا اختلاف (۳) علم اور دولت کی کمی۔ جب تک ہم ان تینوں رخنوں کو دور نہیں کرتے زبان اور ادب کے بہت سے بنیادی اور اہم مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ موجودہ دور کے ادیبوں اور شاعروں کے سامنے تاریخی اسباب کی وجہ سے یہ کوتاہیاں بڑی شدت کے ساتھ آرہی ہیں اس لئے انھیں شعوری طور پر دور کرنے کی ضرورت ہے۔ کانفرنس کے اس اجلاس میں ڈاکٹر حنیفہ نقوی، عالم خوندمیری صاحب اور رضیہ بیگم صاحبہ نے بھی تقریریں کیں۔

کانفرنس کا آخری اجلاس اسی دن (۲۰ مئی) تین بجے اردو ہال میں منعقد ہوا جس میں اردو رسم خط میں اصلاح و ترمیم، اردو ادب کی اشاعت اور وضع اصطلاحات کے مسائل پر غور کیا گیا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے رسم خط کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اصلی چیز زبان ہے لیکن رسم خط کو زبان سے الگ کرنا بھی آسان نہیں۔ رسم خط کے تعلق سے نفسیاتی محرکات اور انسانی جذبات کے عنصر کو بھی نظر انداز کرنا مشکل ہے۔

ترکی میں رسم خط کی تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا مصطفی کمال ایک محبوب لیڈر اور ڈکٹیٹر تھا اس لئے ترکی قوم نے عربی کی بجائے رومن رسم خط اختیار کر لیا لیکن اس کے باوجود موجودہ دور کے سب سے بڑے مورخ ٹائن بی نے جو مشرق وسطی کے امور کا بہت بڑا ماہر ہے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بعض رسم خط کی تبدیلی کی وجہ سے ترکی قوم کی تخلیقی صلاحیتیں گھٹ گئی ہیں اور موجودہ پچیس سال کے دوران میں جو ادب تخلیق ہوا ہے وہ عربی رسم خط والے ادب کے مقابلے میں بہت پست ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اردو رسم خط کو ایک بین قومی رسم خط بتاتے ہوئے خط نستعلیق کی فنی اور جمالیاتی خوبیوں کا ذکر کیا اور اسے ٹائپ کی طباعت کے لئے غیر موزوں بتایا۔ تاہم انھوں نے ٹائپ کو رواج دینے پر زور دیا اور اس بات کا مشورہ بھی دیا کہ ہم آواز حروف کو ترک کیا جا سکتا ہے۔

سجاد مرزا صاحب نے اردو رسم خط کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو میں فارسی، عربی اور سنسکرت تینوں زبانوں کی آوازیں موجود ہیں نستعلیق کے حسن پر اظہار خیال کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ بعض مذہبی موانعات کی وجہ سے مسلمانوں نے تصویر کشی سے احتراز کیا لیکن ان کے جمالیاتی ذوق نے رسم خط کو حسین سے حسین تر بنا کر اس کمی کو پورا کیا تاہم موجودہ سائنسی دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ

تحریر کے رسم خط کو طباعت کے رسم خط سے الگ کیا جائے اور طباعت کے تمام اغراض کے لئے ٹائپ اختیار کیا جائے۔

عالم خوندمیری نے کہا کہ اردو بولنے والے کروڑوں عوام ہیں لیکن لکھنے والے نسبتاً کم ہیں اس لئے ہمیں رسم خط کے سوال کو حل کرکے بولنے والوں اور لکھنے والوں کے درمیان کے اس فصل کو کم کرنا چاہئے تاکہ اردو کہیں بھی اقلیت کی زبان نہ رہے۔

عام بول چال کی ہندی اور اردو میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ہم ایسی بول چال کی زبان کو مقبول بنانے کی کوشش کریں اور ساتھ ہی رسم خط کی تبدیلی پر غور کریں تو اس سے اردو کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ اس کا دائرہ اور وسیع ہو جائے گا۔

محبوب نارائن نے اردو رسم خط کو ایک طرح کا شارٹ ہینڈ بتایا اور کہا کہ شعور کی رو کا ساتھ اردو سے زیادہ اور کوئی رسم خط نہیں دے سکتا۔ ان کا خیال ہے کہ جمالیاتی حسن کے علاوہ یہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ رسم خط ہے تاہم انھوں نے تجویز کی کہ تحریر کے لئے تو اردو رسم خط ہی کو برقرار رکھا جائے لیکن طباعت کی عصری سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے دیوناگری رسم خط اختیار کر لیا جائے۔

شہاب الدین دسنوی نے اس بات پر زور دیا کہ اردو کا موجودہ رسم خط ایشیا کے بڑے حصے میں رائج ہے اور دنیا کا دوسرا بین الاقوامی رسم خط ہے اس لئے اسے ترک کرنے سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوگا۔ اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے انھوں نے مطالبہ کیا کہ ہائی اسکول اور کالج کی درسی کتابیں ٹائپ میں شائع کرکے تدریجی طور پر نسخ اور ٹائپ کو رواج دیا جائے تاکہ ہم ترقی یافتہ طباعت کے فن سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

ڈاکٹر جعفر حسن نے وضع اصطلاحات کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کوئی زبان اس وقت تک سائنٹفک نہیں ہو سکتی جب تک اس میں علمی اصطلاحات کا ذخیرہ نہ ہو۔ وضع اصطلاحات کے موقع پر تین باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ (۱) اصطلاحات سے صحیح مطلب ظاہر ہو (۲) لکھنے میں خوبصورت اور بولنے میں آسان ہو (۳) حتی الامکان اصطلاحات ایسی ہوں کہ انھیں اردوایا جائے۔

رائے جانکی پرشاد نے وضع اصطلاحات کی تاریخ اور شعبۂ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر اصطلاح رائج بھی ہو۔ ایسی اصطلاحیں جو جاندار ہوتی ہیں رائج ہو جاتی ہیں اور جو غیر موزوں اور بے جان ہوتی ہیں کھوٹے ہوئے سکوں کی طرح ان کا بھی چلن بازار سے اٹھ جاتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں ہزاروں اصطلاحات وضع کی گئیں جن میں سے بیشتر رائج ہوئیں اور انھیں کی بنیاد پر علوم و فنون کی سینکڑوں کتابوں کا ترجمہ اور اردو میں اعلیٰ تعلیم ممکن ہو سکی لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ان اصطلاحات کو مرتب کرکے شائع نہیں کیا گیا۔ انھوں نے تجویز رکھی کہ ان تمام اصطلاحات کو فوراً شائع کرنے کا بندوبست کیا جائے۔

عبدالقادر سروری نے وضع اصطلاحات کے پرانے اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے ان پر نکتہ چینی کی اور کہا کہ بحالت موجودہ عربی اور فارسی پر تکیہ کرنے کی بجائے بول چال کی زبان سے مدد لینی چاہئے۔

آل احمد صاحب سرور نے کہا کہ اصطلاحات کے وضع کرتے وقت چلن، رواج، مقبولیت اور عمومیت پر توجہ دینی چاہئے۔ فنون کی حد تک عربی اور فارسی کی جو اصطلاحیں رائج ہو چکی ہیں ان کو جاری رکھا جائے لیکن زبان کے سرمائے کو بڑھانے کے لئے ہندی اور دوسری زبانوں کی عام اصطلاحوں کو اپنایا جائے۔

محمد محی الدین علی صاحب نے اردو ہندسوں کی اصلاح پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ان کے لکھنے کے باضابطہ کوئی اصول نہیں ہیں جس کی وجہ سے مبتدی کو بڑی دشواری پیش آتی ہے بعض ہندسے ایسے ہیں کہ جو دائیں سے بائیں جانب لکھے جاتے ہیں اور بعض بائیں سے دائیں جانب۔ اسی طرح اور بھی نقائص کا ذکر کرتے انھوں نے تجویز رکھی کہ اردو ہندسے بائیں سے دائیں جانب پابندی سے لکھے جائیں اور ایسا ہی پڑھا بھی جائے۔ مثلاً ۲۳ کو لکھنا ہو تو پہلے دہائی کا عدد (۲) اور پھر اکائی کا عدد (۳) لکھا جائے اور جب پڑھا جائے تو بیس تین یا بیس پر تین پڑھا جائے۔ اسی طرح ۱۱، ۱۲، ۱۹ کو موجودہ طریقہ سے گیارہ، بارہ، انیس کی بجائے دس ایک، دس دو، دس نو پڑھا جائے۔ یہی طریقہ سینکڑے اور ہزار کے ہندسوں کو پڑھنے کے لئے اختیار کیا جائے۔

غلام ربانی صاحب تاباں نے مکتبۂ جامعہ کے تجربات کی روشنی میں اردو کتابوں کی اشاعت کی مشکلات پر روشنی ڈالی اور اس کام میں سہولت پیدا کرنے اور اسے آگے بڑھانے کے متعلق اچھی رائے کا اظہار کیا۔ انھوں نے اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ گھٹیا قسم کا لٹریچر تو بہت بڑی تعداد میں فروخت ہوتا ہے لیکن اچھے قسم کی کتابیں بہت کم بکتی ہیں

مباحث کے خاتمہ پر اردو کے تحفظ، ترقی اور اصلاح کے بارے میں قرار دادیں منظور ہوئیں جنھیں علیحدہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں **پروفیسر مجیب** صدر کانفرنس نے کہا کہ ہم حق اسی وقت مانگ سکتے ہیں جب ہم شہریت کے فرائض کو بھی اچھی طرح انجام دیں اور یہ امید ظاہر کی کہ اس کانفرنس کی روشنی میں ہمارا کام بہت آگے بڑھے گا۔

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

کل ہند اردو کانفرنس حیدرآباد
کی تجاویز

(۱) کل ہند اردو کانفرنس حیدرآباد کا یہ جلسہ اردو کو ہندوستان کی قومی زبانوں میں سے ایک اہم زبان سمجھتا ہے۔ اور اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کے اس قیمتی سرمایہ کا تحفظ اور ترقی ایک قومی فریضہ ہے جہاں اردو ہمدردوں اور حامیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ہندوستانی شہریت کی تمام ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہوں وہاں ان کا یہ بھی حق ہے کہ ان کی شخصیتوں کی نشو و نما کے لئے ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ اس کانفرنس کی رائے میں

(الف) ۱ ۔ ہندوستان کے ہر شہری کا یہ حق ہے کہ اس کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہو اور اس بنا پر تمام اردو بولنے والوں کی ابتدائی تعلیم کا مناسب انتظام ان علاقوں میں کیا جائے جہاں ان کی قابل لحاظ آبادی ہو

(ب) ۲ ۔ جہاں اس کا مطالبہ ہو وہاں اردو بولنے والوں کی ثانوی تعلیم بھی اردو میں ہونی چاہئے اور اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کا انتظام بھی ہونا چاہئے۔

(ج) ۳ ۔ حیدرآباد میں اور دوسری ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی کافی تعداد ہے وہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے کچھ کالجوں میں بھی اردو کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہئے۔

(د) ۴ ۔ اردو کے ذریعے تعلیم دینے والے استادوں اور استانیوں کی تربیت کے لئے نارمل اسکول اور ٹریننگ کالج کھولے جائیں۔

(۲) کل ہند اردو کانفرنس حیدرآباد کا یہ جلسہ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں میں اردو کو وہ حیثیت نہیں دی جاتی جس کی وہ مستحق ہے۔ اس کانفرنس کی رائے ہے کہ حیدرآباد اور ان علاقوں میں جہاں اردو جاننے والے خاصی تعداد میں ہیں اردو کے زیادہ پروگرام نشر کئے جائیں اور دہلی کے ریڈیو اسٹیشن میں ایک شعبہ ایسا قائم کیا جائے جس کا سارا پروگرام اردو میں ہو۔

(۳) کل ہند اردو کانفرنس کا یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ ہندوستانی شہریوں کے بنیادی حقوق کی روشنی میں اردو جاننے والوں کو عدالتوں اور دفتروں میں اردو میں درخواستیں دینے کاغذات داخل کرنے اور بحث کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ نیز کونسلوں اور اسمبلیوں اور میونسپلٹیوں کی روئدادیں اور حکومت کے اہم اعلانات اور نوٹس وغیرہ بھی اردو میں شائع ہونے چاہئیں۔ اور تمام سرکاری سائن بورڈوں پر دفتروں اسٹیشنوں پر سڑکوں وغیرہ کے نام بھی اردو میں ہونے چاہئیں۔

(۴) کل ہند اردو کانفرنس حیدرآباد کا یہ جلسہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے اپیل کرتا ہے کہ چونکہ دستور میں اردو کو ہندوستان کی چودہ اہم زبانوں میں شمار کیا گیا ہے اس لئے اردو کے تعلیمی، صحافتی، ادبی اور تہذیبی اداروں کو اس طرح امداد ملنی چاہئے جیسے کہ علاقائی زبانوں کے اداروں کو ملتی ہے۔

(۵) کل ہند اردو کانفرنس حیدرآباد اس پر اطمینان ظاہر کرتی ہے کہ (ایس۔ آر۔ سی) رپورٹ میں لسانی اقلیتوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کانفرنس کی رائے ہے کہ ریاستوں کی جدید تشکیل کے لئے جو قانون اس وقت پارلیمنٹ میں زیر غور ہے اس میں لسانی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظات کو بھی اہم جگہ ملنی چاہئے اور ان تحفظات کو موثر بنانے کی تدبیروں پر بھی غور کرنا چاہئے۔

(۶) کل ہند اردو کانفرنس حیدرآباد کی رائے میں اردو بولنے والوں کو صرف حکومت کی امداد پر تکیہ نہ کرنا چاہئے بلکہ خود اپنے طور پر بھی بچوں اور بڑوں کے لئے ایسے تعلیمی مرکز اور ادارے قائم کرنے چاہئیں جن سے سرکاری نظام تعلیم کی کمی پوری کی جاسکے۔

کل ہند اردو کانفرنس حیدرآباد کی رائے میں اس کی اشد ضرورت ہے کہ سارے ملک میں انجمن ترقی اردو کی ریاستی شاخ مقامی شاخوں کی تشکیل اور تنظیم کی

کی جائے۔ یہ کانفرنس اردو کے حامیوں سے اپیل کرتی ہے کہ جن علاقوں میں ایسی شاخیں موجود نہیں ہیں وہاں بہت جلد شاخیں قائم کریں اور جو شاخیں ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور منظم کریں۔

(۸) آل انڈیا اردو کانفرنس حیدرآباد کا یہ جلسہ یہ ضروری سمجھتا ہے کہ اردو نظم و نثر میں جذبۂ آزادی و تحریک آزادی کے متعلق جو سرمایہ ابتداء سے اس وقت تک ملتا ہے اس کا ایک معیاری انتخاب کر کے مئی ۱۹۵۷ء میں شائع کیا جائے تاکہ جب پہلی جنگ آزادی کے سارے ملک میں صد سالہ یادگار منائی جائے تو اردو زبان و ادب کا یہ قیمتی سرمایہ بھی ملک کے سامنے آجائے

یہ جلسہ مرکزی انجمن ترقی اردو ہند سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کتاب کی تیاری کے لئے ایک کمیٹی بنائے اور اس کمیٹی سے سال رواں کے آخر تک "اردو اور آزادی" پر کتاب تیار کرائے جو اردو اور دیوناگری رسم الخط دونوں میں شائع کی جائے۔

یہ جلسہ مرکزی انجمن ترقی اردو کو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہے کہ کتاب کی تیاری کے سلسلے میں جناب ایس۔ اے۔ انصاری صاحب (مالک پاشا آٹو موبائل) حیدرآباد نے ایک سال کے لئے ایک سو روپیہ ماہوار عطیہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے اور کتاب کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری انجمن اسلام بمبئی کی طرف سے اس کے صدر جناب سیف طیب جی صاحب نے لے لی ہے۔

یہ تجویزیں مرکزی انجمن ترقی اردو کو بھیج دی جائیں گی۔ اور اس سے درخواست کی جائے گی کہ ان کے بارے میں مناسب کارروائی کرے۔

(۹) اس کانفرنس کی رائے ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کتابوں کی درآمد اور برآمد پر جو پابندیاں ہیں وہ اردو ادب کی اشاعت کو سخت نقصان پہنچا رہی ہیں یہ کانفرنس دونوں حکومتوں سے اپیل کرتی ہے کہ ان پابندیوں کو جلد سے جلد دور کریں اور اس کی عام اجازت ہو کہ کتابیں ایک ملک سے دوسرے ملک میں آزادی سے بھیجی جاسکیں۔

(۱۰) اس کانفرنس کی رائے میں اردو ادب کی اشاعت کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ بک کلب کی قسم کے ادارے قائم کئے جائیں۔ یہ کانفرنس کل ہند انجمن ترقی اردو اور دوسرے اداروں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اس کام کی طرف توجہ کریں۔

(۱۱) چونکہ اردو ہندوستان کی اہم قومی زبانوں میں سے ہے اور اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اس لئے یونیورسٹیوں میں اردو کا علیحدہ شعبہ قائم کیا جائے اور اسے نہ عربی، فارسی سے ملایا جائے اور نہ ہندی کے ساتھ۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ سے آگے)

اسی رات حضرت جگر مراد آبادی کی صدارت میں لیڈی حیدری کلب میں مشاعرہ ہوا جس میں علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان، مخدوم محی الدین، غلام ربانی تاباں، آل احمد سرور، سجاد ظہیر، شاہد صدیقی، سلیمان اریب، قیصر زیدی، سرور ڈانڈا، کنول پرشاد کنول، سید شہیدی اور دوسرے شعراء نے کلام سنایا۔

۱۸ مئی کو پانچ بجے انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی طرف سے تمام مہمانوں کا استقبال کیا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے انجمن کے نئے پروگرام پر روشنی ڈالی اور تمام اردو والوں سے اپیل کی کہ وہ منظم ہو کر انجمن کے ساتھ تعاون کریں اور اردو کی تحریک کو کامیاب بنائیں۔